ٹیپو سلطان ــ مصلحت اندیش یا آزاد کیش؟

محمد صبیح انور

ہم پاکستانی بھول جاتے ہیں کہ امامِ عالی مقام حسینؓ استحصاری نظام کے خلاف علانیہ بغاوت کی علامت ہیں۔ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اُن کی شہادت میں صرف جعفریوں یا مسلمانوں کے لیے ہی سبق موجود نہیں، بلکہ کُل عالمِ انسانی کے پِسے ہوئے، مظلوم و مجبور، استحصال زدہ طبقے کے لیے عزم و ہمّت اور جراُتِ کردار کا ایک زرّیں درس ہے۔ جوش ملیح آبادی نے امامؓ کی عالمگیر دعوت کی طرف اشارہ کچھ یوں کیا ہے؂

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی، "ہمارے ہیں حسینؓ"

مگر حسینؓ ماضی کی یادگار ہی نہیں، حال کی تصویر اور مستقبل کا آئینہ بھی ہیں۔ رُوئے ارضی پر آج بھی ظلم کے مہیب بادل چھائے ہیں۔ مسلم رعایا ملوکیت، آمریت اور غیر کی کاسہ لیسی کا طوقِ گلو افشار گردن میں پہنے ہے۔ اصرارِ بیعت اور انکارِ بیعت کا بازار آج بھی گرم ہے۔ ایسے میں مرگِ حسینؓ ایک مُردہ حقیقت سے بڑھ کر ایک زندہ و جاوید پیامِ حیات نہیں تو اور کیا ہے؟

تاریخ کے پردہ سیمیں پر جاں نثاری اور حریتِ عمل کی اَن گنت خوں فشانیاں مرتسم ہیں۔ کردار مختلف بھیس بدل کر آتے ہیں اور ہمارے ضمیر کو ٹٹولتے اور جھنجھوڑتے ہیں۔ تناسخ کا عقیدہ مذہبی طور

یہ غلط سہی مگر تاریخی اعتبار سے ایک بدیہی حقیقت ہے ۔ اگر شہدا کے
<u>قبیلے</u> کے پیش امام ، حسینؓ ہیں تو صفِ اوّل کے ایک اور شہید
<u>ٹیپو سلطان</u> بھی ہیں ۔ علیؓ اور فاطمہؓ کے بیٹے کو بھلا دینے والی نسلیں ، آج
علی حیدر اور فاطمہ فخر النساء کے پسرِ نامدار فتح المک سلطان ٹیپو کو بھی
یکسر فراموش کر چکی ہیں ۔ سرنگا پٹم ، میسور میں ٹیپو کی لحدِ پُرانوار کے احاطے میں
داخل ہوں ، تو ایک رُباعی شہیدِ اوّلی حسینؓ سے شہیدِ اُخرای ٹیپو کی ذہنی ،
قلبی اور علامتی وراثت کی کیا آئینہ دار ہے ؎

از فاطمہؓ زوجۂ علیؓ شیرِ خدا
شد سبطِ نبیؐ ، سیّدِ شہداؓ پیدا
ایں فاطمہ زاد از علی حیدر
ٹیپو سلطان کہ "گم گشت شاہ شہدا"

" شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے " یہ وہ
مقولہ ہے جو ہم سب جانتے تو ضرور ہیں اور اس سے زبانی اقرار کا دم بھی بھرتے ہیں ،
مگر نوبت عملی ثبوت کی ہو تو ہم اپنی اپنی کچھاروں سے باہر لپک آتے ہیں اور
بھیڑ بکریوں سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے مستعد نظر آتے ہیں ۔ یہ وہ موقع ہے جب
شیر روباہی پر اتر آتے ہیں ۔ ایسے میں مصلحت جرأت پر حاوی ہو جاتی ہے ۔
عقلیت پسندی غیرت اور عملیت پسندی حریت کو زیرِ پا کر دیتی ہے ۔ مظلومیت
تحمل کی دلیل بن جاتی ہے اور بے ضمیری ، روشن ضمیری کا روپ دھار لیتی ہے ۔

عصرِ حاضر میں ، ٹیپو کی برسی کے موقع پر ، جب ہم شہید موصوف کے کارناموں اور اس کے کردار کی "عصری معنویت" تو کیا ، خود اس کے "متن" سے انحراف نہیں کر چکے ، ٹیپو کو دوبارہ زندہ کیا جائے تو کیسے ؟ کیا اُسے زندہ کرنے کی فی الواقع ضرورت بھی ہے ؟ معلوم تو یوں ہوتا ہے کہ آج ہمیں ٹیپو جیسے روشن خیال ، اعتدال پسند مگر آزاد نفس کی ضرورت اٹھارویں صدی کے میسور سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ آئیے ہم ۴ مئی کے مبارک دن اِس شاہین کے کردار پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں ۔ یوں کہیے کہ یہ ماضی کے سانچے میں حال کی ایک ننھی سی جھلک ہے یا پھر مستقبل کی تاریخ کا ایک اور نقش ۔

اگر حیاتِ ٹیپو کو ایک لفظ میں سمونا ہو تو میں کہوں گا کہ وہ لفظ ، وہ جذبہ ہے "حرّیت" — "آزادی"۔ ٹیپو نے ایک طرف فرنگ کی بیرونی یلغار کو بڑی بے جگری سے روک رکھا تو دوسری طرف میسور کی معاشرتی اور معاشی تفریق کے ساتھ جنگ لڑی ۔ "خارجی اور داخلی ، ہر دو طرح کی غلامی سے نجات" ، یہی ٹیپو شہید کا طرۂ اِمتیاز ٹھہرا ۔

بیرونی آویزش

سلطان ہر طرف سے دشمن کے نرغے میں تھے ۔ ایک طرف عظیم مغلیہ سلطنت اپنے عروج ، حتّٰی کہ وجود کی آخری سانسیں تاجِ برطانیہ کو گروی رکھ رہی تھی ، تو دوسری طرف ٹیپو کے ہندوستانی ہمسر ایک ایک کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی جھولی میں گرتے جا رہے تھے ۔ نظامِ حیدرآباد اور مرہٹہ شاہی نے مصلحت اِسی میں دیکھی کہ وقت کی "بہتی کاویری" میں بہہ جائیں ۔ اُنہوں نے کمپنی سے غیر مسابقت بلکہ معاونت کا معاہدہ کر لیا ۔ سراج الدولہ ، نواب بنگال

کے بعد یہ ٹیپو سلطان، نواب میسور ہی تھے جنھوں نے اس وقت کی عظیم ترین طاقت کے
سامنے زانوئے مصلحت دھرنا تو درکنار، اس سے باوقار دُشمنی کا حق بھی ادا کر دیا۔
اُن کی شہادت کمپنی کے لیے حکومت، بلا شرکتِ غیرے کا مژدہ ثابت ہوئی۔ میسور دِلّی
کی دہلیز ٹھہرا۔ گویا سلطان کی مُشکبو نعش نے برطانوی تسلّط کے جسم میں زندگی کی
رُوح پھونک دی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو میسور کی چوتھی اور فیصلہ کن جنگ میں ٹیپو کا
جسمِ اطہر "گمنام سپاہیوں" کے ایک ڈھیر میں ملا۔ ۱۵ مئی کو نظامِ حیدرآباد نے
اس خوشخبری کی خوشی میں اپنا قیمتی ہار انگریز ریذیڈنٹ مسٹر کرک پیٹرک کے
زیبِ گلو کیا اور ۴ اکتوبر کو برطانوی پارلیمنٹ نے "ترکیشِ ہندوستان کے آخری تیر"
کے ضائع ہونے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے قراردادِ تبریک منظور کی۔
کمپنی تجارت کے مقصد سے ہندوستان میں داخل ہوئی، مگر تجارت اس کا
منتہائے مقصود نہ تھا۔ ٹیپو جیسا دُور رس اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ انگلستان
کا مقصد دراصل ہندوستان پر اپنا تسلّط قائم کر کے اس کے ذہنی، سیاسی، ثقافتی اور
مادّی وسائل پر اجارہ داری قائم کرنا تھا۔ ایک طرف اُس نے انگلستان سے پیکارِ مسلسل کی
راہ اپنائی تو دوسری طرف وہ عالمی قوّتوں کے سیاسی توازن سے بھی پوری طرح واقف تھا۔
اُس نے فرانس کے بادشاہ لوئس شش‌دہم، عثمانی خلیفہ عبدالحمید اوّل اور افغان فرمانروا
ظاہر شاہ سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کی ٹھانی اور ان کے مُلکوں میں اپنے سفارتی وفد
بڑے کرّوفر کے ساتھ بھیجے۔ اس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ ٹیپو اپنے خارجی معاملات میں
شدّت برائے شدّت کے قائل نہ تھے، بلکہ زمانے کی سیاسی نبض پر مستحکم ہاتھ اور عالمی
قوّتوں کے درپردہ عزائم پر اتھاہ نظر رکھتے تھے۔

غلامی کا تصور بھی ٹیپو کے لیے قابلِ گوارا نہ تھا ۔ اُن کی آزاد پسندی ملاحظہ ہو
کہ اُن کے ضخیم کُتب خانے سے "امریکی خود مختاری کے اعلامیہ" کا فارسی ترجمہ دستیاب ہوا
اس منشور میں لکھا ملتا ہے کہ، "امریکہ کی متحدہ ریاستیں حلف اُٹھاتی ہیں کہ
اپنے بنیادی حق کی رُو سے وہ تاجِ انگلیشیہ سے وفاداری کے عہد سے دستبردار ہوتی ہیں
اب وہ خودمختار رہیں اور حکومتِ برطانیہ سے ہر قسم کی سیاسی نسبت توڑتی ہیں"۔ نوآبادیاتی
نظام کے خلاف امریکی جنگ دراصل ٹیپو کے لیے ایک مثال کا درجہ رکھتی تھی ۔ شاید اسی لیے
۴؍جولائی ۱۷۸۳ء کو برطانیہ پر امریکی فتح کو علامتی تحسین پیش کرنے کے لیے سلطان نے ۱۰۸
توپوں کی سلامی کا حکم دیا ۔

داخلی استحکام

ٹیپو اِس قانونِ حکومت سے باخبر تھے کہ بیرونی دشمن سے مقابلہ اسی
صورت ممکن اور جائز ہے جب رعایا خوشحال اور مستحکم ہو ۔ جب اُن میں خوداعتمادی اور
خودپسندی کا وصف موجود ہوگا ۔ بیرونی یلغار کے مقابلے میں شمشیر تبھی کارگر ہوگی، جب
قوم کے نوجوانوں کی خودی صورتِ فولاد ہوگی ۔ اُن کے دل و دماغ پر اپنے عوام الناس
کے تفوّق کا عالم دیکھنا ہو تو ۱۷۸۷ء میں ان کی طرف سے جاری ہونے والے حکمنامے
کی ایک شق پر نظر رہنی چاہیے، "اپنے ہی عوام کے خلاف ہتھیار اُٹھانا گویا خود سے
جنگ کرنا ہے ۔ یہ عوام ہی تو ہمارے ہتھیار اور ہمارے سپر ہیں ۔ یہ ہمارے نوجوان نہیں
تو اور کون ہیں جو ہمیں زندگی کی نعمتوں سے *متمتع کرتے ہیں؟ چنانچہ تم اپنی تمام تر جارحانہ
قوتوں کو صرف اپنے مجموعی دشمن کے لیے بچا کر رکھو"۔ شاید ایسی ہی عوام پسندی اور
رعایا پروری کی آج ہمیں ایک بار پھر ضرورت ہے ۔

* متمتّع

انسانی مساوات اور معاشی برابری ٹیپو کے سیاسی اصل الاصول تھے۔

انھوں نے ریاست میسور میں زمینی اور زرعی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ فوجی اور انتظامی اُمراء کو نئی زمینیں مرحمت کرنا ایک طرف، جو زمینیں پہلے سے "اُمرا" کو دی گئی تھیں، واپس لے لی گئیں۔ اس کے باوجود ٹیپو نے کاشتکاری کے مقامی مزاج اور صدیوں سے رائج بیوپار کے نازک کاروباری رشتوں پر زد نہیں پڑنے دی، جبکہ ہمسایہ بنگال میں لارڈ کورنوالیس نے بیک زدِ قلم، ان مستقل رشتوں پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ آن واحد میں زرعی عمّال کو جاگیردار بنا ڈالا گیا۔ افسوس کا مقام کہ بنگال کی طرح پاک و ہند کے بیشتر علاقوں میں یہی جاگیرداری مزاج ہماری نس نس میں سرایت کر رہا ہے اور ہماری تہذیبی بنیادوں کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔

حرب و ضرب، علم و فن اور صنعت و حرفت کے کم ہی گوشے ایسے ہوں گے جو سلطانِ معظم کی دوررس نگاہ سے بچ پائے ہوں۔ تجارت، زراعت، مویشی بانی اور کپڑا سازی سے لے کر فولادسازی اور آبی جواہرات کی سی صنعتیں ٹیپو ہی کے زیرِ سایہ پروان چڑھیں۔ یقیناً وہ اپنے زمانے کی گرفت سے بہت آگے اور وقت کی حدود پھلانگ چکے تھے۔ بھارتی صدر ابوالکلام نے ۱۹۹۱ء میں بنگلور میں ٹیپو یادگار لیکچر پیش کرتے ہوئے اُنہیں ہندوستانی راکٹ سازی کا مُوجد بھی قرار دیا۔

احترامِ آدمیت کا یہ تصوّر تھا کہ کوڑوں کی سزا، خُود موجب سزا ٹھہری۔ ہم ایسے انسانی حقوق کے نام لیواؤں کے لیے نہ جانے ان کے کس کس عمل میں مثال موجود ہے! سلطان شہید نے انسانی قربانی اور یتیموں، بیواؤں کی تجارت پر پابندی لگائی، تو ٹیپو نے وجہ یہ بیان کی، "یہ محض دینی مسئلہ نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ اور شراب پہ پابندی لگی ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کی اخلاقی اور معاشی ترقی کے ذمہ دار بھی ہیں اور شراب ان اقدار کی راہ میں حائل ہے۔"

افغانستان اور عراق میں فوج کشی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ ہم "ہیبت اور حیرت" (SHOCK AND AWE) کی جنگوں کے عادی بن چکے ہیں۔ مقاتل اور معصوم، مسلّح اور لاچار کی تفریق ختم ہو گئی ہے۔ ویرانہ ہو یا آبادی، بارود کے قالین بچھ جاتے ہیں۔ ایسے میں ٹیپو جیسے جنگجو حکمران کے عسکری اخلاق کا نمونہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے فرمایا، "شکست خوردہ فوج کو لوٹنا محض چند زر پرستوں کی ہوس ہے اور کچھ نہیں۔ مگر یہ عمل خود فاتح قوم کو مفلوک اور فاتح فوج کو رسوا بناتا ہے۔ یاد رہے، ہماری جنگیں صرف میدانِ جنگ تک محدود رہیں اور خدارا، انہیں شہریوں پر مسلّط نہ کرو۔"

حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" یعنی قوم کا حکمران قوم کا خادم ہوتا ہے۔ ٹیپو اس قول کے صادقُ المصدوق دکھائی دیتے ہیں۔ رعایا پروری اور عوامی خدمت کا سبق بھول جائے تو آج ہمارے اُمرا اور اشرافیہ کے لیے ٹیپو کو دیکھنا کافی ہوگا۔ نپولین کو لکھے گئے ایک خط میں انہوں نے اپنے آپ کو "جمہوریۂ ہندوستان کا پہلا شہری" قرار دیا۔ ٹیپو کا دور وہ دور تھا جب پورا یورپ مُطلق العنان حکمرانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ خود برطانیہ کاروباری آمریت کے پنگھوڑے میں اپنے ابتدائی سانس لے رہا تھا۔ اور ہندوستان کے کوتاہ نظر حکمران غُلامی کا تاج اپنے سروں پر سجا رہے تھے۔ ایسے میں ٹیپو آزادیٔ رعیّت کا آخری مگر روشن ترین چراغ ثابت ہوئے۔ ۱۷۸۹ء میں جب اُن کے شاہی آستانے "دریا دولت" کی تعمیر کا موقع آیا تو عوام کی جبری مشقّت کے خلاف ایک درباری تقریر میں انہوں نے فرمایا، "ایسی تعمیر کو دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ یہ دیکھو،

یہ وہ یادگار ہے جو لوگوں کی آہوں اور سسکیوں پر کھڑی ہے۔ کیا تمہیں اُن رعایا کے آہ و فریاد کی آواز سُنائی نہیں دیتی جنہیں حکمرانِ وقت نے اس کی تعمیر میں گھروں سے دلیس نکالا دیا، جنہیں زنجیروں میں جکڑا گیا اور غُلام بنایا گیا؟ یہ سب محض اس لیے تھا کہ حکمران اپنی فوقیت کے گھمنڈ میں اِتراتا پھرے۔ ہرگز نہیں۔ ایسی برتری بھی بھلا کوئی برتری ہے، جس میں ہمارے محلّات اور عمارتوں کی بنیادوں میں انسانوں کے آنسوؤں اور خون کی آمیزش ہو جائے؟"

ٹیپو سلطان ماضی کا ایک کردار ہیں۔ دُرُست۔ مگر باریک گوشی سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ وہ زمانۂ حال میں بھی ہم سے مخاطب ہیں۔ ماضی پرستی کے زُعم میں ہم اپنے کرداروں کی فُوقُ الوَقتی اور ابدیّت کے مُنکر ہو جاتے ہیں۔ شہیدِ کربلا رضی اور شہیدِ میسور، ہر دو کے ساتھ یہی ہُوا۔ امام حسین رضی نے یزید کو کہلا بھیجا تھا کہ "مِثلی لا یُبایِعُ مِثلک" یعنی مجھ جیسا کوئی، تُم جیسے کسی کی کبھی بھی بیعت نہیں کرے گا اور یہی اُن کے پیغام کی مُداوَمت کا مَظہر بھی ہے۔ مگر ہوتا کچھ ایسے ہے کہ مقرّر کی بلیغ بیانی، مرثیہ نگار کی منظر نویسی اور مُؤرّخ کی عرق ریزی ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ سامعین اور قارئین قافلہ دارِ کربلا پہنچ جاتے ہیں۔ فرات کے کنارے نوزائیدہ مُلوکیت کی رسمِ تاجپوشی بھی خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ رسمِ شبیری رضی اور اندازِ کوفی و شامی کے بدلے پینتروں کا مشاہدہ بھی بنفسِ نفیس کر لیتے ہیں۔ مگر کیا کبھی ایسا بھی ہُوا کہ کربلاؤں کے جو میدان اکیسویں صدی میں ہمارے سامنے سجے، ہمیں دعوتِ نظّارہ دے رہیں، ہم ان کی طرف بھی آنکھ اُٹھا کے دیکھ سکیں؟ کیا وجہ ہے کہ آج کے میر صادق صاحبِ صدق کہلائے جانے لگتے ہیں؟ قومی اور ملّی مفاد کے راستے میں بے نُور عقل پرستی اور کم اندیش عملیّت پسندی آڑے آجاتی ہے؟

ٹیپو ہماری فاتحہ خوانی کا مستحق تو بنتا ہے مگر ہمارے لیے جذبۂ عمل اور عوامی رائے کی اصابت کی تحریک نہیں بنتا ۔ اس کی تعریف تو شاید آج بھی ہم کر لیں ، مگر بحیثیت قوم اس کی تقلید ؟ خیالِ خام ۔

مگر ٹیپو کا ابدی پیغام آج ہمیں یہی مشورہ دے رہا ہے کہ ؎

آتشے در دل دگر بر کردہ ام
داستانے از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجرِ آئینہ فام
می کشم او را بتدریج از نیام
نکتہ گویم ز سلطانِ شہید
زاں کہ ترسم تلخ گردد روزِ عید
پیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او
تا شنیدم از مزارِ پاکِ او
"دو جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہم چو مرداں جاں سپردن زندگیست"

(اقبال)

مفہوم : "میرے سنے دل نے ایک درد کی آگ سلگا لی ہے ۔ میں دکن سے ایک نئی داستان لے کے آیا ہوں ۔ میرے پہلو میں ایک صیقل تلوار ہے جو میں دھیرے دھیرے نیام سے باہر نکال رہا ہوں ۔ میں تمہیں ایک نکتہ بتاؤں جو میں نے سلطان شہید ٹیپو سے سنا ؟ مگر میں یہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس سے تمہاری عید کی خوشیاں سرد نہ پڑ جائیں ۔ مگر تو سنو ! اس سے پہلے کہ میں اُن کی خاک کا بوسہ لیتا ، ان کی پاکیزہ تربت سے میں نے ایک آواز سنی : "اگر تو دو جہانوں میں شیر مردوں کی طرح زندہ نہیں رہ سکتا تو تیرے لیے زندگی اسی میں ہے کہ بہادروں کی طرح جان سپردِ خدا کر دے ۔""